ڈاکٹر محمد اجمل کی وفات

پرچہ پریس میں تھا کہ خبر آئی کہ ملک کے معروف درویش صفت دانش مند ڈاکٹر محمد اجمل (رحمۃ اللہ علیہ) ۳۰ / جنوری ۱۹۹۴ء کی صبح ۷۴ سال کی عمر میں جسم کی قید سے رہا ہو گئے اور اس جنت میں پہنچ گئے جو بہ قول ان کے روح کا اصلی مقام ہے۔ ڈاکٹر اجمل پاکستان کے ان چند افراد میں سے تھے، جن کو خدا نے فکر و نظر اور تقریر و تحریر کی تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ انھیں تعلیم و تدریس، ادب، فلسفہ، نفسیات اور تصوف سے گہرا شغف تھا، اپنی ملازمت کی پہلی منزل میں انھوں نے تعلیم و تدریس میں بڑا نام اور عزت پائی۔ وہ بنیادی طور پر معلم تھے اور آخری وقت تک معلم ہی رہے۔ جس کی وجہ سے پورے ملک میں ان کے پھیلے ہوئے شاگرد ان سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ شروع ہی سے انھیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ دنیائے انسانیت کے عظیم معلموں ۔ سقراط، افلاطون، حضرت مسیح اور آل حضرت علیہ الصلاۃ والسلام ۔ کی وراثت کے امین ہیں۔ اس احساس نے انہیں جہاں ایک کامیاب استاد کا کردار ادا کرنے میں مدد دی، وہاں اسی احساس نے انہیں تلاش حق کی راہ پر لگایا، جس پر وہ اپنے دم واپسیں تک چلتے رہے دنیاوی منصب کی کوئی کرسی۔ پرنسپل، گورنمنٹ کالج، لاہور، وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی، سیکرٹری تعلیمات، مرکزی حکومت، ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکی۔

زندگی کی آخری منزل میں وہ مغرب میں شون (Schuon) کی معروف صوفی تحریک (شاذلیہ) سے وابستہ ہو گئے، جس سے ان کے تصوف کو جلا ملی۔ تصوف کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ اس کے پاس انسانی روح کی بیماریوں کا بہتر اور کامیاب علاج ہے۔ اور اس راہ پر چل کر انسان خالق و مخلوق کے درمیان حائل

پردوں کو چاک کرسکتا ہے۔ چند سال قبل ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر اجمل نے "نفس کی صوفی سائنس" (Sufi Science Of The Soul) کے نام سے ایک خوبصورت مقالہ لکھا، جس میں انہوں نے انسانی نفس، روح اور قلب کے باہمی رشتوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ انسانی قلب کو جیتنے کے لیے نفس اور روح میں جنگ بپا رہتی ہے۔ اگر میدان روح کے ہاتھ رہتا ہے، تو پھر انسانی قلب ازسرنو خدائی تجلیات کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے۔ دل کو مصفی و مجلی کرنے اور بھولے ہوئے عہد و پیماں (الست بربکم) کو یاد کرنے کے لیے اللہ کی یاد ازبس ضروری ہے۔"

جن لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کو سقراط، جلال الدین رومی، شیخ ابن عربی مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ اقبال اور ژنگ پر بولتے سنا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ حسن بیان اور خیالات کی صفائی کیا چیز ہے۔ جن سے موجودہ وقت میں ہمارے اکثر دانشور محروم ہیں۔ خیالات میں انتشار اور بیان میں ژولیدگی ہمارے فکری مسائل میں الجھاؤ کا سبب بنی ہے۔ ہم اکثر مغالطہ کو منطق تصور کرتے ہیں، جس کی وجہ سے فکر و نظر سے عاری نعروں کی پیروی کو دین و دنیا کی کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔

افسوس! جس مبدء فیاض نے انہیں فکر و نظر کی نعمتوں سے نوازا تھا، اس نے ان سے کام لینے کا کوئی خاص سرو سامان مہیا نہیں کیا۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ ادب، فلسفہ، نفسیات، تصوف، علامہ اقبال کے فکر اور تعلیمی مسائل پر مجتہدانہ اور عارفانہ نگاہ رکھتے تھے۔ اس میدان میں۔ ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ لیکن براہو فکر معاش اور خوف فساد خلق کا " کہ بے شمار سخنہائے گفتنی، ناگفتہ رہ گئے"۔ اس کی کسی حد تک ذمہ داری خود ڈاکٹر صاحب کے مزاج پر بھی عائد ہوتی ہے۔ جو نظم و ضبط سے چنداں آشنا نہیں تھا۔ ۱۹۸۱ء میں وہ اسلام آباد چھوڑ کر بلوچستان یونیورسٹی چلے گئے تھے۔ جہاں مرحوم آغا اکبر شاہ، سابق وائس چانسلر اور پروفیسر انور کھیتران، سابق سیکرٹری تعلیمات، بلوچستان گورنمنٹ، نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے دیدہ و دل فرش راہ کئے، خیال تھا کہ ڈاکٹر اجمل ہمارے فکری اور تعلیمی مسائل یا علامہ اقبال کے فکر پر لیکچرز دیں گے جنہیں بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ افسوس! وہ کوئٹہ کی سردی سے تنگ آکر جلد واپس اسلام آباد آگئے۔ آخری عمر میں انہیں احساس تھا کہ انہوں نے وقت کے اہم موڑ پر ملی مسائل پر رہنمائی کرنے کے لیے ایک سنہری موقعہ کھو دیا۔

انھوں نے راقم کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا تھا :- "میں یہاں خیریت سے ہوں اور انٹرویوز (پبلک سروس کمیشن) کے چکروں میں الجھا رہتا ہوں۔ انٹرویوز کے بعد یہ سوچتا رہ جاتا ہوں کہ میں نے ان رسمی ملاقاتوں (انٹرویوز) سے کیا پایا؟ کیا سیکھا؟ تو سوچتے سوچتے لاجواب ہو کر رہ جاتا ہوں۔"

القصہ انہوں نے بہت کم لکھا، لیکن جو لکھا، خوب لکھا[1]۔ بیرون ملک میں بھی۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔ وفات سے دو تین دن پہلے وہ لاہور تشریف لائے اور U.G.C کے مقامی دفتر میں اپنے آخری مضمون سائنٹیفک کلچر، Scientitic Culture پر ڈاکٹر محمد افضل، سابق وزیر تعلیم اور راقم سے بات چیت کرتے رہے۔ اس نوٹ میں انہوں نے کلچر اور تہذیب (Civilization) جیسے نازک اور اہم مسئلے پر نہایت ہی اختصار اور خوبی و صفائی سے لکھا، جسے ڈاکٹر محمد افضل نے سراہا، طے پایا کہ وہ اس مضمون میں مزید اضافے کریں گے اور اسے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع کیا جائے گا۔ افسوس! ادارے کا یہ خواب پورا نہ ہوسکا۔ ۱۹۷۲ء سے راقم کی ان سے آشنائی تھی۔ انہیں جس رنگ میں بھی دیکھا، سرکاری کرسی پر یا کرسی کے بغیر۔ درویش خدامست پایا۔ اگر کبھی ملاقات میں دیر ہو جاتی تو پیغام بھجواتے کہ میرے خرچ پر اسلام آباد چلے آؤ القصہ گذشتہ بیس سالوں میں جب کبھی ان سے ملنے گیا، انہیں مسکراتے ہوئے پایا اور جب کسی مسئلے پر بولتے تو ان کی گرمی گفتار دیدنی ہوتی۔ جب محفل ختم ہوتی تو روح میں صبح کی تازگی پاتا۔ اب دیکھیے کب ادھر سے پیغام آتا ہے کہ، میرے خرچ پر، چلے بھی آؤ کہ منتظر ہے بزم ارواح۔ انہوں نے ۱۹۸۴ء میں راقم کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:- "۲۰ نومبر کو فیض صاحب لاہور میں انتقال کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خبر اتنی جاں کاہ تھی کہ میں کئی روز تک سکتے میں رہا۔ ان سے بہت سی ملاقاتوں کی یادیں ذہن پر چھائی رہیں۔ خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ عجیب درویش انسان تھا۔ ایسے لوگ ہر روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔" قرنہا باید کہ تایک مرد حق پیدا شود"۔ ڈاکٹر صاحب کے ناگہانی آخری سفر پر ان کے یہ الفاظ میرے ذہن میں برابر گھوم رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اجمل کا تعلق برصغیر کے ایک سنہری عہد سے تھا۔ جس نے ٹیگور، اقبال، آربندو گوش، ابوالکلام آزاد، اور فیض کو جنم دیا تھا۔ اجمل صاحب اس عہد کے شاید آخری آدمی تھے، ان کی وفات سے "قبیلہ مجنوں کا کوئی فرد باقی نہیں رہا"، رہے نام اللہ کا۔

1۔ ہم المعارف کے آئندہ شمارے میں ڈاکٹر مرحوم کی تحریروں کا انتخاب اور تعارف پیش کریں گے۔

رشید احمد (جالندھری)